eISSN:2789-6331
pISSN:2789-4169

اردو افسانے میں انسان دوستی کی روایت

Humanisim in urdu short stories

صائمہ اقبال، لیکچرار شعبہ اردو، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی فیصل آباد
سدرہ نذیر، ایم۔فل اسکالر گورنمنٹ کالج یونیورسٹی فیصل آباد

Saima Iqbal, Lecturer, Department of Urdu, GCUF.

Sidra Nazir, M.Phil. Scholar, GCUF.

Abstract:

The main subject of literature is man, so how is it possible that this genre is sensitive to such a sensitive aspect Humanism. Writers on this subject must have written from the beginning.

When the Humanism movement came into being, the world of literature, using the flames of its creative consciousness, made every effort on its own to bring the lives of human beings, crushed in the mill of oppression, to the page.In connection with the tradition of philanthropy in Urdu fiction The following are some of the most representative fiction writers in the field of humanitarian tradition in Urdu fiction:

ادب کا بنیادی موضوع ہی انسان ہے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ یہ صنف لطیف انسان دوستی جیسے حساس پہلو سے پہلو تہی کیے ہوئے ہو۔ ابتدائے آفرینش سے ہی اس موضوع پر لکھنے لکھانے والوں نے قلم اٹھایا ہو گا۔ کیونکہ انسان وہ واحد مخلوق ہے جس کا اکیلے گزر بسر کرنا تقریباً ناممکن ہے۔ اسی غرض وغایت سے معاشرہ وجود میں آتا ہے۔

روزافزوں ٹیکنالوجی نے جہاں زندگی کو اس قدر آسان بنایا ہے۔ آسائش و آرام کی اس زندگی نے دنیا کو تفرقات کی روش سے بھی آگاہ کیا ہے۔ امارت و غربت کے آلام ہر خطے میں دکھائی دیتے ہیں۔ دکھی انسانیت کی مساعی کے لیے وہ جذبہ مفقود نظر آتا جس سے ان کی دادرسی مطلوب و مقصود تھی۔ ترقی نے نچلے طبقے کو شدید نقصان پہنچایا غلامی کا ایک ابدی طوق ان کے گلے میں لٹکا دیا کہ وہ ہمیشہ کے لیے غلام ہی رہیں گے۔

چنانچہ مختلف نظامِ ہائے زندگی کے ہوتے ہوئے وہ تمام نظریات جو انسان کی فلاح وبقا کے لیے بنائے گئے ناکافی محسوس ہونے لگے۔ تو ایک ایسی تحریک ابھری جس نے انسان کو انسان کی ضرورت و اہمیت کی طرف خاطر خواہ توجہ صرف کرنے پر زور دیا۔ اس تحریک کا نام انسان دوستی کی تحریک ہے۔

انسان دوستی۔ معنی و مفاہیم

لفظ انسان دوستی جس کا مترادف Humanism دراصل ایک لاطینی لفظ ہے۔ یہ لفظ Humansim دو الفاظ کا مرکب ہے جو کہ بالترتیب "Homo" اور "Genus Humans" ہیں۔ "Homo" بمعنی "انسان" جب کہ دوسرا لفظ "Genus Humans" کا مطلب "انسانیت" ہے۔ لفظ کی ساخت ہی اس بات کی عکاس ہے کہ یہ تحریک کس قدر انسان اور اس کے گردوپیش سے علاقہ رکھتی ہے۔

انسانیت نام ہے ایک خوبصورت احساس کا۔ جو دوسروں کی بہتری، بہبود، فلاح اور اصلاح کے امور کے لیے انسان کو متحرک رہنے پر آمادہ کرتی ہے اور منفی عوامل و عناصر سے حد درجہ گریز کی تلقین کرتی ہے۔

"قومی انگریزی لغت" میں بھی "Humanism" کے معنی کچھ اس انداز میں بتائے گئے ہیں:

> "انسان نوازی، انسان دوستی، مذہب انسانیت، انسان پسندی، مسلک انسانیت، انسان پرستی وہ نظام یا فکر و عمل کا مسلک جس میں انسانی اور دنیاوی مفادات حاوی ہوتے ہیں، انسان دوست مفکرین کے ادب اور خیالات میں پھر سے دلچسپی، جنھوں نے مذہب کو کم اہم قرار دیا۔"(1)

"قومی انگریزی لغت" کی تعریف جو وہ انسان دوستی کے حوالے سے کرتے ہیں اور اس بات کی غمازی کرتی ہے کہ مرکز و محور انسان کی ذات ہے۔ وہ تمام افکار و نظام جو انسان کے لیے اس کی بھلائی مفادات کے پیشِ نظر ہوں گے وہ انسان دوستی ہی ہے۔

"آکسفورڈ ڈکشنری" میں اس کے معنی کچھ یوں رقم ہیں:

1. "Belief in the mere humanity of Christ.
2. The character or quality of being human, devotion to human intrest.
3. Any system of thought or action which concerned with more human intrest, (as distinguished from derin) or with those of the distinguished from individual, the religion of humanity.
4. Devotion of those studies which permote human culture, literally culture, especially the system of the humanists, the study of the Roman and Greek classic which came into vogue at the Renaissance."(2)

یہ مفاہیم اس بات کو ترجیح دیتے ہیں کہ اس ایک ایسا ضابطہ حیات ہو جو انسان کی بڑھوتری اور بہتری کو ہی ملحوظ خاطر رکھے اور وہ تمام امور جو خدمات کے طور پر انسان بجالائے قابل تحسین و داد کے مستحق ہوں۔ ان کو اولیت حاصل ہو۔

"انسان دوستی" تحریک کے بنیاد گزار

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جب وہ وقت آیا جب استحصالی قوتوں نے سر اٹھایا اور انسانوں میں طبقے اور تفرقے وجود میں آئے۔ انسان کی زندگی کو دوبھر کیا جانے لگا تو باقاعدہ افراد کے اندر اس بات کا شعور آیا کہ ان کی عظمت کے لیے کوئی ایسی جماعت یا گروہ ہونا چاہیے جو ان کے حقوق کا تحفظ فراہم کرے اور انسان کو اس کے مقام

سے آگاہ کرے۔ انسان کو پتہ ہو کہ وہ اس دنیا میں حکمران ہے نا کہ ماتحت تمام برابر ہیں اور برابری کے درجے کے تحت حقوق و فرائض کا ایک سلسلہ دنیا میں وجود رکھتا ہے۔

اس شعور کی آبیاری انسان دوستی تحریک کے ذریعے ہی ممکن تھی اور اس کا وجود تب منظرِ عام پر آیا جب کلیسا کی تعلیمات اور اصول و ضوابط نے غیر انسانی سلوک کو روا رکھنا جائز کر دیا تھا۔ انسان دوستی کی اصطلاح 1808ء میں ایک جرمن ادیب (F.J.Neihemmer) نے وضع کی لیکن اس کا اجرا بعد ازاں اٹلی میں ہوا۔ اٹلی کا مشہور ادیب اور شاعر پیٹرارک (Petrark) انسان دوستی "Humanism" کا بانی کہلاتا ہے۔

انسان دوستی اور دینِ اسلام

تمام الہامی مذاہب میں بنیادی اور مشترک تعلیم فلاحِ انسانیت کی تھی۔ دینِ اسلام میں منبع و ماخذ انسانیت ہی ہے۔ تمام تر احکامات خداوندی جو اس نے اپنے برگزیدہ نبی اکرم (ﷺ) کے ذریعے سے دنیا کے لوگوں کو دیے ان سب میں ایک معتدل و شاداب انسانی معاشرے کی تصویر پنہاں ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

''اَلْمَالُ وَالْبَنُوْنَ زِیْنَۃُ الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا'' (سورۃ الکہف)

ترجمہ: مال اور اولاد دنیاوی زندگی کی زینت ہیں۔"(۳)

مال و زر کی رغبت، انسانی سرشت میں ایک فطری امر ہے۔ لیکن اس سے دوری کی تلقین کی گئی ہے کیونکہ انسان اس کرۂ ارض پر مال و متاع کے لیے نہیں آیا بلکہ وہ حسنِ سلوک کا پابند بنایا گیا۔

اردو افسانے میں انسان دوستی کی روایت

انسان دوستی کی تحریک معرضِ وجود میں آئی تو دنیائے ادب نے اپنے تخلیقی شعور کی جولانیاں بروئے کار لاتے ہوئے ظلم و جبر کی چکی میں پستے ہوئے انسانوں کی زندگی صفحہ قرطاس پر لانے کی اپنے اپنے طور پر بھرپور سعی کی۔

اردو ادب بھی اس ضمن میں کسی بھی ادب سے پیچھے نہیں رہا۔ اردو ادب میں افسانے کے دریچے کو کھولا جائے تو لامحالہ بہت سے ایسے درہم پر وا ہوتے ہیں کہ جن سے انسانیت سسکتی نظر آتی ہے تو کیونکر یہاں کے ادباء اپنی زمین کے واسیوں سے پہلو تہی کیے ہوئے خیال کی آماج گاہ میں اپنے جوہر کو صرف کرتے رہتے۔

ادباء نے اپنے گرد و پیش کے عوامل کا جائزہ لیا اور ان سے وہ کردار لیے جو پورے معاشرے کے عکاس ہیں۔ ادیب اپنے معاشرے کے انسان کی آواز بنا۔

اردو افسانے میں انسان دوستی کی روایت کے سلسلے میں چند نمائندہ افسانہ نگاروں کا ذکر حسبِ ذیل ہے:

پریم چند

پریم چند کی افسانہ نگاری کے پس منظر میں دیہات کا ماحول کار فرما ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے وہ دیہات کی خالص آب و ہوا سے برائیوں اور رویوں کو کشید کرنے کے درپے ہوں۔ انھیں سسکتی، جلتی بجھتی انسانیت کا دکھ محسوس ہوتا ہے اور وہ اس کے لیے کوشاں ہوتے ہیں۔

پریم چند کو اردو افسانے کے بانیوں میں شمار کیا جاتا ہے انھوں نے اس مختصر کہانی میں وہ مختصر مختصر سی جزئیات اتنی باریکی اور صفائی سے رقم کی ہیں کہ مناظر قاری کے ذہن پر گہرا اثر ڈالتے ہیں۔ انسان دوستی کے لیے پریم چند اپنے کرداروں کی ذاتیات اور باہمی کشمکش پر غور کرتے ہیں اور ان کے باہمی تعلق و اساس کی بنا پر رشتے کے لیے خلوص کی عرق ریزی کرتے ہیں پریم چند نہ صرف انسان دوستی سے متعلق قلم کشاں ہیں بلکہ وہ ان عوامل کو بھی اپنے افسانے میں جگہ دیتے ہیں جو کہ انسانی رویوں میں منفیت کے باعث بنتے ہیں۔

آل احمد سرور اس ضمن میں رقم طراز ہیں:

> ''مغربی افسانوں کے مطالعے، بیسویں صدی کے نت نئے انقلابات اور پریم چند کے اثر نے افسانہ نگاری میں نئے نئے رجحانات پیدا کر دیے۔ اب افسانہ نگاری صرف تفریح زر ہی وہ فریاد کی ایک لے بن گئی۔''(۴)

ان نت نئے تجربات کی ہی ایک رو انسان دوستی ہے۔ پریم چند کے ہاں بچوں کی داد رسی کے عناصر، جاگیر دار طبقے کے مظالم، بیوہ عورتوں کے مقام کے لیے ایک جدوجہد کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ جن میں معصومیت کے درپہ ہونے والے سفاک چہروں کی نقاب کشائی کرتے ہیں کہ وہ کیسے معصومیت کو اچک لیتے ہیں اور انسانوں کے اندر انسان دوستی جیسے جذبے کے فروغ کی راہ میں ایک رکاوٹ کے طور پر ثابت ہوتے ہیں۔

پریم چند کا افسانہ ''پوس کی رات'' انسان دوستی کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔ اس افسانے میں بنیادی کردار ہلکو کو سخت سردی کا سامنا ہوتا ہے لیکن وہ اس کی مدافعت کے لیے کوئی سامان نہیں رکھتا۔ اس نے کمبل خریدنے کے لیے تین روپے جمع کیے ہوتے ہیں جو کہ ایک زمیندار اس سے لے جاتا ہے کیونکہ ہلکو نے اس سے قرض لیا ہوا ہوتا ہے اور اس

قرض کو چکانے کے لیے ہلکو تین روپے جو کمبل کے لیے جوڑے ہوتے ہیں زمیندار کو دے دیتا ہے اور خود خالی ہاتھ رہ جاتا ہے۔

اب پھر سے فاقوں والی ڈائن اس کو منہ پھاڑے دیکھنے لگ جاتی ہے اور نئے سرے سے مزدوری کرنا شروع کرتا ہے۔ دوسری طرف پوس کی رات میں اسے اپنی فصل سے آس ہوتی ہے۔ وہ اس کی رکھوالی کے لیے کھیتوں میں ہی ہوتا ہے۔ لیکن ایک رات کھیت میں جانور گھس آتے ہیں جو کہ ساری فصل کو تباہ کر جاتے ہیں اور ہلکو کے کتے (جبرا) کو بھی مار دیتے ہیں اور ہلکو کی دادرسی کو کوئی نہیں پہنچتا۔

افسانے کے تانے بانے سے پریم چند ان رویوں پر کاری ضرب کرتا ہے جو خود تو آرام دہ اسباب پیدا کر کے میٹھی نیند سو گئے اور غریب ہلکو کے لیے زندگی کو ایک عذاب بنا دیا۔ نفع و نقصان سے بالاتر اگر ہلکو کے حالات کے مد نظر اگر زمیندار چاہتا تو وہ قرض کو معاف بھی کر سکتا تھا اور مزید برآں وہ ہلکو کی کسی طرح سے مدد بھی کر سکتا تھا تاکہ وہ بھی اس کڑاکے کی سردی میں کچھ گھڑیاں ٹھٹھرنے سے نجات حاصل کر پاتا۔ اس نے تو زندگی کو پیہم رونا ہی سمجھا کیونکہ اس کے گرد و پیش میں انسانیت کا خوبصورت جذبہ مفقود تھا۔

پروفیسر قمر رئیس افسانے پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''ہلکو کا کردار ہندوستانی کسان کی صدیوں کی مظلومی، مجبوری اور افلاس کی علامت ہے دن رات کی محنت کے باوجود دنیا میں کوئی نہیں جو اسے زندہ رہنے کا سہارا دے۔ قدرت بھی بے مہر دشمن کی طرح اس پر گھات لگائے رہتی ہے۔''(۵)

لیکن یہ سفاکی کا دور آخر کب تک۔ کیا محض مالی معاملات سے ہی تو انسانیت کا دور دورہ ہوتا ہے جب کہ انسانیت کا تو دور دور تک مادیت اور مالیت سے کوئی سروکار ہی نہیں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ اپنے فرائض کے بارے میں عوام الناس آگاہ ہو۔ یہ افسانہ اسی آگہی کا پیش خیمہ ہے۔

پریم چند کا ایک اور عمدہ شاہکار اور شہرۂ آفاق افسانہ ''کفن'' ہے۔ جس نے ان کو شہرت دلائی اور ابدیت کی فہرست میں پریم چند کا نام رقم کروا دیا۔ یہ افسانہ بھی نچلے طبقے کے کرداروں کے ذریعے پنپتا ہے۔ پیٹ کی بھوک انسانی رشتوں کی تمیز بھلا دیتی ہے اور سفاکیت کو جنم دیتی ہے۔ انسان دوستی کے فروغ کے لیے سارے معاشرے کی اجتماعی کاوش درکار ہوتی ہے۔ نہیں تو افسانہ ''کفن'' جیسے عناصر ہی روز بروز نظر آئیں۔

بقول گوپی چند نارنگ:

"کفن میں بھوک اور ناداری کی انتہا انسان کو حیوانیت اور سفاکیت کی سطح پر لے آتی ہے اور وہ رشتوں کو پائے حقارت سے ٹھکرا دیتا ہے۔"(۶)

صاحب اثر ورسوخ جب تک افرادِ عامہ کے لیے کوشاں نہیں ہوتے تب تک صورتحال کچھ یوں ہی چلتی ہے۔ ادبا اپنے اپنے معاشرے کے افراد کی تصویر کشی کرتے چلے جاتے ہیں۔ جب کہ بالا طبقے کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی۔

اسی حوالے سے گوپی چند نارنگ مزید کہتے ہیں:

"اونچی ذاتوں اور صاحبِ اقتدار طبقے نے جس طرح انسان کا استحصال کیا ہے اور اس کی روح کو نچوڑ کر اس کو عام انسانی حس تک سے محروم کر دیا ہے حیوان کی سطح پر جینے کے لیے مجبور کر دیا ہے۔ یہ کہانی اس کی دردناک طنزیہ تصویر ہے۔"(7)

مزید لکھتے ہیں:

"پریم چند ایک سنگین سچائی سے پردہ اٹھاتے ہیں اور آخری وار ایسا بھرپور کرتے ہیں کہ پوری کہانی نام نہاد انسانیت اور شرافت کے منہ پر زبردست طمانچہ بن جاتی ہے۔"(۸)

محض اپنی ذات کے خول میں بند رہنے والے معاشرے کی بہت سی چھوٹی چھوٹی خوشیوں کے آگے بڑے بڑے بند ثابت ہوتے ہیں۔ جن سے کوسوں دور انسانیت لرزتی اور سلگتی رہتی ہے۔

اختر اورینوی

اردو افسانے کی ترتیب کے حوالے سے اس روایت کو دیکھا جائے تو اختر اورینوی پریم چند کے بعد وہ نمائندہ افسانہ نگار ہیں جنھوں نے اپنے افسانوں کو تخیل کی وادیوں سے لبریز کرنے کی بجائے مظاہر ارضی اور اس کے باشندوں کے قیام کا مسکن بنایا۔

اختر اورینوی کے افسانوں میں دیہات کی سرزمین ہے۔ وہ مگدھ کے دیہاتوں کا ذکر لاتے ہیں جہاں کی زمین زرخیز اور انسانیت تباہ حال ہے۔ وہ ایسے معاشی، معاشرتی پہلوؤں کی عکاسی کرتے نظر آتے ہیں جو بظاہر تو معمولی نظر آتے ہیں لیکن بغائر نظر اگر دیکھا جائے تو معاشرتی بیخ کنی تک کے حامل ہوتے ہیں۔

اختر اورینوی اپنے افسانوں میں جہاں انسان کی دیگر ضروریات کی بات کرتے ہیں وہاں وہ انسان کو کاملیت کا درجہ دیتے ہوئے اور فطرت کی خواہش کا بھی پرچار کرتے ہیں جو کہ انسان کو بعض اوقات انسانیت سے گرا دیتی ہے۔

ان کے ہاں جنسی ناآسودگی کے عناصر بھی ملتے ہیں۔ ان کے نمائندہ افسانوں میں ''ممتا''، ''مشکور دادا''، ''پاگل''، ''تسکینِ حیرت''، ''بے آبرو ہو کر'' اور ''سیکھ جمہور'' وغیرہ شامل ہیں۔ جو نفسیاتی، معاشی، معاشرتی پہلوؤں کے حوالے سے متاثر ہوتی ہوئی انسانیت کے درد کو منظر عام پر لاتے ہیں۔

کرشن چندر

کرشن چندر کا تعلق ترقی پسند تحریک سے تھا اور اسی وابستگی نے ان کے قلب و ذہن پر انسانیت کے پر پیچ سمندر میں جھانکنے اور ان مسائل اور رویوں کی عکاسی کا خیال در آیا۔ یہ افسانے کسی کی لذت طبع کے افسانے نہیں بلکہ مصنف اپنے ماحول سے وہ عناصر چنتا ہے جنھوں نے انسان پر انسانیت کا دائرہ تنگ کیا ہوا ہے۔

کرشن چندر اپنے افسانوں میں معاشرے میں فروغ پانے والے انسانی رویوں کی منظر نگاری بڑے دل دوز انداز میں کرتے ہیں کہ روح تک کانپ جاتی ہے۔ وہ حقائق کو بغیر کسی لگی لپٹی کے بتا دینے کے قائل ہیں۔ ان کا افسانہ ''کالو بھنگی'' ان کے اس انداز کی بہترین مثال ہے۔ کرشن چندر کی کاوش اور گہرے مشاہدے نے اس کردار کو لازوال بنا دیا ہے۔

کرشن چندر انسانیت کا بول بالا کرتے ہیں۔ وہ کرداروں کو معاشرے کا عکاس بناتے ہیں۔ کرشن چندر کرداروں سے حقارت نہیں رکھتے بلکہ وہ ان عناصر کی نقاب کشی کرتے ہیں جو اس کے ذمہ دار ہیں۔ ان کے لیے سب انسان برابر ہیں۔

ڈاکٹر عظیم الشان صدیقی لکھتے ہیں:

> ''کالو بھنگی اگرچہ انسان ہے لیکن ذات نے سماجی اور معاشی ماندگی کی لہر اس کی پیشانی پر اس طرح ثبت کر دی ہے کہ نیک اعمال بھی ان داغوں کو نہیں مٹا پاتے۔ کالو بھنگی اس سماجی تضاد کی نشاندہی کرتا ہے جو فرد کی قدر و قیمت کا تعین عمل، باطن کی پاکیزگی کے بجائے حسب، نسب کی بنیاد پر کیا جاتا ہے۔ لیکن انسانیت کسی کی میراث نہیں ہے۔ کالو بھنگی ہے۔ کالو بھنگی بھی جذبۂ خدمت و ایثار کے باعث احترام کا مستحق قرار پاتا ہے۔''(۹)

بقول عظیم الشان صدیقی ''لیکن انسانیت کسی کی میراث نہیں ہے'' کہ مصداق کرشن چندر معاشرے کے ان تمام انسانوں کے لیے انسان دوستی کا خواہ ہے جنھیں ذات، پات، رنگ، نسل کی زنجیر کے تازیانے ہمہ وقت لگتے رہتے ہیں۔

راجندر سنگھ بیدی

ممتاز ترقی پسند افسانہ نگار راجندر سنگھ بیدی انسانیت کا پرچار بڑے علائم و رموز سے کرتا ہے۔ وہ ادبیت کی شان سے معاشرے کی سفاکیت سے پردہ اٹھاتا ہے اور وہ مصیبت و آلام جو انسان دوستی کے قلع قمع کے درپہ ہیں ان کی طرف قاری کی توجہ دلاتا ہے۔

وہ ہر مجبور و مظلوم و ظالم تک کی نفسیات کے بخیے ادھیڑتے چلتے جاتے ہیں تاکہ سب کے ساتھ انصاف کا معاملہ کر سکیں۔ ان کے افسانوں کی اپنی ایک الگ پہچان ہے۔ اس انفرادیت کے حصول میں ان کے اسلوب کو اہمیت حاصل ہے جو ان کے گہرے مشاہدے اور حساس دل کی دین ہے۔ ان کے افسانوں میں ''بھولا''، ''مان کی من میں''، ''چھوکری کی لوٹ''، ''تلاوان''، ''لچھمن''، ''رحمٰن کے جوتے'' اور ''چیچک کے داغ'' وغیرہ اہمیت کے حامل ہیں۔

''گرہن'' بیدی کا مشہورِ زمانہ افسانہ ہے۔ جس میں آسمان اور زمین دونوں پر بیک وقت گرہن لگا ہوتا ہے۔ ایک گرہن چاند کو اور دوسرا گرہن گابھن ہولی کا لگتا ہے۔ ''ہولی'' افسانہ گرہن کا مرکزی کردار ہے۔ جسے سفاک انسانیت کشی جیسے افراد کے ہاتھوں مجبور ہونا پڑتا ہے۔ اس پر لگا گرہن چاند کے گرہن سے بھی زیادہ تاریک اور تقریباً اس کی ساری عمر پر ہی محیط ہے۔ کسی ایک رات کا قصہ نہیں ہے اور ہولی جیسی اور پتہ نہیں کتنی معصوم لڑکیاں اس ہوس کے گرہن کی ہولی کو سجانے کی بھینٹ چڑھ جاتی ہیں۔ پس پردہ کا اندازہ کرنے کے لیے انسانیت کو جاگنا ہوگا اور انسان دوستی کا مظاہرہ کرنا ہوگا۔ بیدی کی آواز اس راہ کی ایک یلغار ہے۔

سعادت حسن منٹو

سعادت حسن منٹو ایک اہم افسانہ نگار ہیں اس نے افسانے کی اس جہت میں لکھا ہے کہ دوبارہ کوئی اس کی ہمسری نہ کر سکا۔ دراصل پردوں کی چاکی کے لیے ضرورت ہوتی ہے ایک جرأت کی، حوصلے کی، نڈر ہونے اور بے باکی کی اور سب سے بڑھ کر اپنے معاشرے میں رہنے والے ان کرداروں پر بیتی بپتا سمجھنے اور احساس کرنے کرنے والی کیفیت کی۔

اور یہ سب چیزیں منٹو میں خداداد تھیں۔ انھوں نے معاشرے کے لیے بہترین سے بہترین طریق پر وہ مصوری کی ہے کہ ان کا ایک ایک افسانہ انفرادی اہمیت کا حامل بن گیا۔ وہ موضوعات کو کوئی بہت اعلیٰ وارفع کرداروں سے نہیں جوڑتے ان کے نزدیک معاشرے کا ہر انسان ان کی توجہ کا مستحق ہے۔ وہ حقیر سے حقیر اور معمولی سے معمولی واقع سے بھی ایک نکتہ نکال لینے پر قادر ہیں کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔

انسان دوستی کا مرقع ہے کہ وہ عوام الناس کے درد کو اپنی تحریروں میں اول و آخر پوری یکسوئی سے اہمیت دیتے ہیں۔ وہ درد جو انسانوں کو عزت و آبرو گنوا کے ملتا ہے۔ عورتوں کی آبروریزی سے ملتا ہے معاشی عدم مساوات سے ملتا ہے اور اسی طرح دیگر معاملات جن کا واسطہ احساسات و جذبات انسانیت سے براہِ راست ہوتا ہے۔ منٹو پر کئی مقدمات بھی ہوئے۔ عریانی کے الزام بھی لگے لیکن ان کے موقف کے مطابق میں صرف وہ ہی لکھتا ہوں جو یہ معاشرہ کرتا ہے۔ اگر اس میں عزت و تکریم کا پہلو ہوتا تو میرے افسانے بھی اس سے ممیز ہوتے۔ اب اگر یہ معاشرہ اور اس کی معاشرت ہے ہی ننگی تو میں کیا کروں۔

منٹو کے تقسیمِ ہندوستان کے موقع پر لکھی گئی کہانیوں میں انسان دوستی کے بہترین مرقعے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ انھوں نے تقریباً بیس کے قریب اس موضوع پر کہانیاں لکھیں۔ جن میں سب سے زیادہ شہرت ''کھول دو''، ''ٹھنڈا گوشت''، ''دوتری''، ''ٹیٹوال کا کتا''، ''گورمکھ سنگھ کی وصیت''، ''موذیل'' اور ''ٹوبہ ٹیک سنگھ'' کو ملی۔

منٹو کے ہاں ایک انسان دوست ادیب کی انوکھی مثال ملتی ہے۔ انھوں نے تمام تر خلیجوں کو پاٹ کر ایک مساوی سلوک کرتے ہوئے بلاامتیاز ہندو، مسلم اپنے افسانوں کا تانا بانا بنا ہے۔ منٹو کا افسانہ ''ہتک'' انسانیت کا پرچار کرنے والوں کے منہ پر ایک طمانچہ ہے۔ وہ نام نہاد انسان دوستی کا پروردہ مرد جو ایک طوائف سے اچھا سلوک نہیں کر سکتا وہ معاشرے میں کس کردار کا حامل ہو گا۔

ممتاز شیریں افسانے پر تبصرہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> ''ہتک کی سوگندھی میں منٹو نے طوائف کے اندر چھپی ہوئی عورت کو پایا ہے اور اس کی روح کو چھوا ہے۔ تیز جذبات والی جو سیٹھ کے ''اونہہ'' کی توہین کا بخار مادھو حوالدار پر نکالتی ہے اور آخر میں سارے مردوں سے نفرت کے اظہار کے طور پر اپنے خارش زدہ کتے کو اپنے پہلو میں لٹا کر سو جاتی ہے۔''(۱۰)

عورت کے اندر طوائف کا عنصر در آنا ایک معاشرتی عمل ہے۔ کوئی بھی شوق سے اس راہ کا مسافر نہیں بنتا یہ بھی ایک غیر انسانی رویہ ہی ہے جو اس کو بڑھاوا دیتا ہے اور اپنے نفس کی تسکین کے لیے وہ کسی کی آبروریزی جیسی غلاظت سے بھی نہیں کتراتا۔ لیکن ایک طوائف ایک عورت بھی ہوتی ہے۔ عزت، مان، پیار خلوص اس کا بھی حق ہے وہ انسان جو اسے اس راہ پر لانے کے ذمہ دار ہیں وہ یہ سب دینے کے بھی ذمہ دار ہیں۔ عورت کو محض لذت کشیدگی کا عنصر سمجھنا جہالت کی بدترین شکل ہے اور انسانیت سے عاری معاملہ یہی ایک درس جو منٹو نے دینے کے لیے اس کے فروغ کے لیے ایک پوری زندگی کو صرف کر دیا اور اسی درس نے اسے لازوال بھی کیا۔

عصمت چغتائی

عصمت چغتائی ترقی پسند افسانہ نگار کی فہرست میں شامل وہ خاتون ہیں جن کے نام سے ہی عجیب و غریب الزام اور ترددات ذہن میں آجاتے ہیں۔ لیکن انھوں نے جس جرات سے کام لیا وہ اپنی مثال آپ ہے۔

مردوں کے معاشرے میں ایک اکیلی عورت کا اتنی بے باکی سے انسانیت کے لیے ان گوشوں کی نقاب کشائی کرنا پورے معاشرے کے سامنے جن کے بارے میں گھر کی چار دیواری میں بھی بات کی جائے تو آواز حلق میں گھٹ جائے۔ لیکن عصمت نے بلاخوف و خطر انسان دوستی کا ثبوت دیتے ہوئے انسان کی اس فطری ضرورت اور اس کی اہمیت کی طرف اشارہ کیا جو کہ رفتہ رفتہ غیر اخلاقی اور تحقیر انسانیت کا سفر طے کر رہی تھی۔ ایک صحت مند معاشرے کے لیے اس میں ظاہر اور باطن دونوں سطحوں پر محتاط رویے کار فرما ہونے چاہیں۔

انسانی ساخت ہی ایسی ہے کہ وہ خلافِ فطرت امور سے اگر روبرو ہو تو ایک ہیجانی صورتحال جنم لیتی ہے۔ جس سے سارا معاشرہ اور تمام انسانیت مریض بن جاتی۔ جنس کا صحیح ادراک اور اس کے جائز تصرف سے انسان میں انسانیت کی معراج باقی رہتی اور یہی عصمت چغتائی کا موقف تھا۔ وہ کسی معاشرے کو یا تہذیب کو ننگا یا بے نقاب نہیں کرنا چاہتی بلکہ وہ ایک صحت مند معاشرے کا احیاء چاہتی ہے جس کو جنس کا دیمک بنیادوں سے کمزور کر رہا اور انسان رشتوں کی تمیز کو بھول رہا ہے۔

وقار عظیم اس ضمن میں لکھتے ہیں:

> ''عصمت کا بڑا اضافہ یہ ہے کہ انہوں نے ہمیں بتایا کہ عورت کے بھی اپنے مسائل ہیں۔''(۱۱)

عصمت چغتائی کا یہ اضافہ کوئی معمولی نہیں ہے۔ عورت انسان کے اس معاشرے میں بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ انسان دوستی کے تقاضے کو نبھاتے ہوئے عصمت چغتائی نے اس کی آواز بلند کی۔

احمد ندیم قاسمی

احمد ندیم قاسمی کے اندر بھی انسانیت سے لبریز ایک ادیب نے سر اٹھایا اور ان کے قلم سے ایسے شاہکار افسانے صفحۂ قرطاس پر آئے جو کہ اپنی مثال آپ بن گئے۔

انھوں نے بڑی چابکدستی اور فنی مہارت سے موضوعات کو افسانے کا رنگ دیا ہے۔ ان کے نمائندہ افسانوں میں ''پرمیشر سنگھ''، ''میں انسان ہوں'' اور ''تسکین'' وغیرہ انسان دوستی کے نکتہ نظر سے لاجواب ہیں۔ ویسے تو احمد

ندیم قاسمی کی کسی بھی کہانی کو لے لیا جائے تو انسانیت کے لیے ان کا قلم لکھنے سے عاجز نہیں آتا وہ اس بات کو اپنے فن کی شان سمجھتے ہیں۔ ان کے افسانوں کے پس منظر میں دیہات کی فضا ہے اور کردار عام عوام سے لیے گئے ہیں۔

ان کے افسانے ''میں انسان ہوں'' میں ایک تعجب و تاسف ہے کہ وہ انسان جس کو اللہ پاک نے شعور دیا علم دیا اور اسے اشرف المخلوقات بنایا ایک حساس دل دیا وہ اس قدر خطرناک، گزند پہنچانے والا اور بھیڑیا صفت کب سے ہو گیا۔

اس کی انسانیت کی معراج کہاں گئی۔ وہ شرف جو اسے تمام مخلوقات پر دیا گیا۔ وہ کیسے اس سے بے بہرہ ہو گیا۔ انسانی بربریت اور مظالم کی تصویر کشی بڑی خوبصورتی سے کی گئی ہے کہ انسان کی اصل یہ فساد نہیں بلکہ وہ بھائی چارے اور اس کا پیامبر ہے۔ اسی طرح ان کے افسانوں پر میشر سنگھ اور تسکین میں بھی سسکتی بلکتی اور استحصال کا شکار ہونے والی انسانیت پر قلم کاری کی گئی ہے کہ کیسے عوامی خیر خواہ انسانیت کے نام نہاد نمائندے انسانیت سے نا آشنا ہے۔ کیسے ان کے دل پتھرا گئے ہیں۔ احمد ندیم قاسمی اور ان کے ساتھ ساتھ دیر بدیر اور بھی بہت سے ایسے اذہان ہیں جنھوں نے دکھی انسانیت اور انسانیت کا استحصال کرنے والے عوامل کی نشاندہی کے لیے اپنا قلم اٹھایا۔ ان میں انتظار حسین، عزیز احمد، ممتاز شیریں، حیات اللہ انصاری، قرۃ العین حیدر، بلراج کومل، جوگندر پال، اشفاق احمد، خواجہ احمد عباس، بلراج منرا، انور سجاد، غیاث احمد گدی، قمر احسن، انور عظیم، عذرا ثقلین، منظر کاظمی، حسین الحق، طارق چھتاری، سیّد محمد اشرف، غضنفر، نیئر مسعود وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ جنھوں نے اپنے افسانوں کے ذریعے انسان دوستی کے فروغ کے لیے اقدام کیے اور معاشرے کو غیر انسانی اقدام پر جھنجھوڑا۔

جدید رجحان کے سبب لکھے گئے افسانوں کے متعلق پروفیسر سیّدہ جعفر کچھ یوں رقم طراز ہیں:

> ''انسانی زندگی اور اس کی معنویت کا ادراک حاصل کرنے کی جستجو نے افسانے کو فلسفے سے قریب کر دیا۔ بعض تجریدی افسانوں میں فلسفیانہ انداز نظر کی ایک جھلک بھی دکھائی دیتی ہے۔ جدید افسانے کا دوسرا میدان افسانے کی خارج سے داخل کی طرف پیش رفت بھی ہے۔ انسان کے داخلی کرب، انسانی تجربے کی کسک اور انسانی مسائل کی طرف نئے لکھنے والے متوجہ ہیں۔ اب افسانہ محض واقعات کا مسلسل بیان نہیں رہا۔ انسانی جذبات و تاثرات اور اس کی روزمرہ زندگی کے تجربات اور تجربے کے معنی آفرینی کا جدید دور کے افسانہ نگار کو اندازہ ہو گیا۔''(۱۲)

ہر دور کا ادیب اپنے معاشرے سے ہی موضوعات لیتا ہے۔ کوئی لگے بندھے موضوعات کی روایت نہیں۔ انسانیت جس حالت سے دوچار ہو گی اس دور کا ادیب بھی اس حالت کو موضوع بنائے گا۔ تو کیسے ہو سکتا ہے کہ کوئی ادیب انسانیت سے رشتہ منقطع کر کے معاشرے پر لکھ سکے۔

حوالہ جات

ا۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، (مرتبہ) قومی انگریزی اردو لغت، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، 1994ء، ص:934

2. The Oxford English Dictionary, vol v, Oxford university press, Amen house, London, 1961, P: 444

3۔ الکہف:46

4۔ آل احمد سرور، پروفیسر، تنقیدی اشارے، لکھنؤ: ادارہ فروغِ اردو، 1966ء، ص:23

5۔ قمر رئیس، منشی پریم چند شخصیت اور کارنامے، لاہور: مکتبہ عالیہ، 1962ء، ص:8•2

6۔ گوپی چند نارنگ، اردو افسانہ روایت اور مسائل، دہلی: عفیف پرنٹرز، 2000ء، ص:186

7۔ ایضاً، ص:166

8۔ ایضاً، ص:170

9۔ عظیم الشان صدیقی، ڈاکٹر، افسانوی ادب تحقیق و تجربہ، دہلی: مکتبہ جامعہ 1983ء، ص:150

10۔ ممتاز شیریں، منٹو نوری نہ ناری، مرتب: آصف فرخی، دہلی: آفسیٹ پریس، 1999ء، ص ندارد

11۔ وقار عظیم، (مضمون) اردو افسانے میں روایت اور تجزیے، نقوش افسانہ نمبر، ص:167

12۔ سیّدہ جعفر، پروفیسر، آزادی کے بعد اردو فکشن، مرتب: احمد ندیم قاسمی، ساہتیہ اکادمی، 2001ء، ص:98